Afkar-e-Taza (Journal of Iqbal Chair), USKT
ISSN:
2023, Vol. 1, No. 1
Page: 1-14

# اقبال اور فینٹیسی

(Iqbal and Fantasy)

**Professor Dr. Ashfaq Ahmed Virk,**
F C College, University, Lahore

***Abstract:***
*Fantasy is the most influential and astounding genre of the literary world. Its intention can be to amaze, entertain or motivate the reader. Writers and poets, from all around the world, have taken revelatory benefit from this wonderful literary genre. It is regretfully analyzed that the writers and critics of Urdu literature have not taken any significant benefit from this unusual genre. Our national poet of Urdu literature, Allama Iqbal is the most unique and influential representative and spokesman of fantasy. His Urdu and Persian poetry is replete and adorned by the stunning use of the fantasy. Unfortunately, the critics and the researchers of the poetry of Iqbal have never paid any purposeful heed to this aspect of Iqbal's poetry. This research paper analyzes, with terseness and preciseness, the concepts of fantasy and its consequential practice in the poetry of Iqbal.*

**Key Words:** *Allama Iqbal, Fantasy, Wonderful Literature, Urdu and Persian Poetry, Fine Art, Entertainment.*

فینٹیسی، دنیائے ادب بلکہ فنونِ لطیفہ کی ایک نہایت مفید اور حیران کن صنف ہے، جس کا مقصد تحیّر، تفکر، تفریح اور تحریک، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں مصنف اپنے مشاہدے کے زور،علم کی اڑان اور تخیل کی بلند پروازی کے ذریعے کبھی مستقبل کو حال میں کھینچ لاتا ہے اور پیش گوئی کے انداز میں مخصوص حالات و واقعات کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ کبھی وہ عمرِ رفتہ کو آواز دے کر حال کے شانہ بشانہ لا کھڑا کرتا ہے اور کبھی کبھی ماضی و مستقبل دونوں کو حال میں یک جا کر کے ان کے تخیلاتی روابط اور تضادات کے موازنے سے قارئین کو محظوظ و متاثر کرتا ہےبعض اوقات تو وہ بالکل ہی خیالی انداز میں کسی انوکھی نرالی مخلوق سے معمور ریاست کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے اور کہیں خواب و خیال ہی میں ہفت آسماں کی سَیر کرتا ہے۔ گویا ایک فینٹیسی نگار، متخیلہ کی متنوع صورتوں سے معاشرے میں نہ صرف تفریح، اصلاح اور تربیت کے نئے نئے اندازسامنے لاتا ہے بلکہ وہ لکیر کے فقیر اور روایت کے اسیر لوگوں کو روایت سے ہٹ کے سوچنے کے لیے بھی اکساتا ہے۔

مارٹن گرے بہ طور ادبی صنف ، فینٹیسی کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "*Fantasy literature deals with imaginary worlds of fairies, dwarves, giants and other nonrealistic phenomena.*" (1)

جب کہ انسائیکلو پیڈیا امریکانہ میں فینٹیسی کی بابت ان الفاظ میں وضاحت ہوئی ہے:

> *"Fantasy: is a form of imaginative thinking that is controlled more by the thinker's wishes, motives and feelings than by conditions in the objective world. In fantasy the individual is*

*most often not seeking to communicate thought to others but is cheifly sending message to himself. Fantasy is a form of dreaming.* (2)

تہذیب کوئی بھی ہو، لوگ جس زمانے کے بھی ہوں، وہاں کے متنوع اذہان و قلوب کی تسکین کے لیے بعض اوقات ناقابلِ یقین کہانیاں یا ماورائی دنیائیں تراشنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات اور متاثرینِ حالات کے نزدیک انسانی ذہن میں ہمہ وقت پکنے والی کھچڑی اور متواتر جلنے والی آگ کو تُند و تلخ حقائق کے بیان کی بجائے، خنک و شیریں مفروضوں ہی سے بجھایا جا سکتا ہے۔اٹھارھویں صدی کے انگریز معجزہ نگار جوناتھن سوئفٹ نے اس کائنات کے نشیب و فراز یا انسانی رویوں کی مختلف انتہاؤں کو اپنی مشہورِ زمانہ فینٹیسی "*Gulliver Travels*" کے چار منفرد اسفار کے ذریعے مزے دار انداز میں دکھانے اور سمجھانے کی خوب صورت کوشش کی تھی۔ پھر جارج آرویل کی "*Animal Farm*" اور(1984) "*Nineteen Eighty Four*" نے تو ایک عہد کو متاثر کیا۔ اسی طرح ایڈمنڈ سپینسر کی"*Faerie Queen*"اور رڈ یارڈ کپلنگ کی "*Mowgli: Legend of the Jungle*"نے عرصے تک دھوم مچائے رکھی۔ جرمن شاعر گوئٹے کی بلند پایہ تصنیف "فاؤسٹ"سے تو خود اقبال بھی بے حد متاثر دکھائی دیتے ہیں، اور پھر اس بات سے تو آپ سب اتفاق کریں گے کہ جے۔ کے رَولنگ کی مشہورِ زمانہ ناول سیریز"*Harry Potter*" تو اپنی سنسنی خیزی اور روز افزوں دلچسپیوں کی بِنا پر ہماری نئی نسل کو بھی مکمل طور پر اپنی زلفوں کا اسیر بنا چکی ہے۔

دوسری جانب روسی ادب کے تو تقریباً تمام قابلِ التفات ادیب اس خوش نما ادبی حربے کی برکات سے استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے پہلےروس کے قومی شاعر جواں مرگ پُشکن(۱۸۰۰ء-۱۸۳۷ء) ہی کو دیکھ لیں، جن کے نزدیک ادبی کہانیوں میں صحت اور اختصار کے ساتھ ساتھ متخیلہ کی بے حد اہمیت ہے وگرنہ بیان کی خوبی سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ان کے ایک ہم عصر کہانی نویس، گوگول ان کی ایک شاہکار تصنیف سے متعلق رقم طراز ہیں:

"پشکن کی تحریر کردہ ِ'کیپٹن کی بیٹی'مثبت طور پر سب سے اعلیٰ روسی بیانیہ ہے۔یہ اتنا ارفع طور پر خالص اور منفرد ہے کہ اس کے مقابلے میں خود حقیقت مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔"(3)

پھر ان کے بعد آنے والے دوستوفسکی، چیخوف، گورکی اور لیوٹالسٹائی نے بھی متخیلہ کے نہایت استعما ل سے روسی نظم و نثر کو انتہائی رفعتوں سے آشنا کر دیا۔ اسی طرح بیسویں صدی کے منفرد ادیب بلگا کوف کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے، جن کی مشہورِ زمانہ فینٹیسی 'ماسٹر اور مارگریٹا' کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے، جس میں شیطان اپنے دو چیلوں کے ساتھ زمین پر اترتا دکھایا گیا ہے۔ بلگا کوف نے اپنے ان کرداروں کے ذریعے ہمیں تاریخ کے مختلف ادوار سے منفرد انداز سے متعارف کرایاہے۔ راجا عبدالقیوم اپنے ایک مضمون "الیگزینڈر پشکن"میں بلگا کوف کی اسی تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" بلگاکوف کی کتاب مافوق الفطرت واقعات سے بھری پڑی ہے اور شیطان کے کردار کے ذریعے اس نے قاری کو تاریخ کے مختلف ادوار کی سیرکرائی ہے۔ اس موضوع پر ازمنہ قدیم سے ہی بہت لکھا جا چکا ہے۔یورپی ادب میں گوئٹے کے 'فاؤسٹ' اور کرسٹوفر مارلو کے 'ڈاکٹر فاسٹس' جیسےشاہ کاروں کی موجودگی میں کوئی ایسی تحریر لکھنا ، جو بہ یک وقت عام قاری اور دانش وروں کی

> توجہ حاصل کر سکے ایک مشکل امر ہے۔ بلگاکوف نے اس مشکل کو آسان کر دکھایا ہے۔"(4)

اُردو ادب میں فینٹیسی کا آغاز تو قطب شاہی دور میں منظرِ عام پہ آنے والی پہلی نثری داستان، مُلّا وجہی کی 'سب رس' (سالِ تصنیف:۱۶۳۴ء) ہی سے ہو گیا تھا۔اس کے بعد منصۂ شہود پہ آنے والا سارے کا سارا داستانوی ادب ، فینٹیسی ہی کی ہمہ رنگ صفات و برکات سے لبالب ہے۔ ۱۸۵۷ء کے نتیجے یا بعد میں آنے والے ادب میں اگرچہ معروضیت و موزونیت کا رنگ غالب آتا چلا گیا لیکن اس کے باوجود جہاں جہاں مولانا محمد حسین آزاد، مرزا فرحت اللہ بیگ، اودھ پنچ کے بعض من چلوں یا رومانوی تحریک کے کچھ دل جلوں کے ہاں در آنے والی بعض فینٹیسیوں کا ذکر آتا ہے، تو ذہن میں رنگ و نور اور الوہی سرور کی پھلجھڑیاں سی چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ بالخصوص سجاد انصاری کی "محشرِ خیال"تخیلاتی ادب کی دلچسپ ترین صورت ہے۔ جس میں ان کا شریر تخیل حضرتِ انسان کی تشریح و توجیح ان الفاظ میں کرتا ہے:

> " فرشتے اور شیطان کے درمیان منافقانہ سمجھوتے کا نام انسان ہے۔"(5)

نسیم حجازی کی "سو سال بعد"، "سفیدجزیرہ"، "ثقافت کی تلاش" اور "پورس کے ہاتھی"بھی اس صنف کی بہتر نمایندگی تھی لیکن محمد خالد اختر کی جارج آرویل کی (1984) کے تتبع میں لکھی "بیس سو گیارہ"اور "کھویا ہوا اُفق"میں شامل بعض دیگر مضامین میں اس صنف کی نسبتاً بہتر صورت دکھائی دیتی ہے، جسے پڑھنے کے بعد معروف مزاح نگار کنہیا لال کپور نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ:

> "کاش مَیں اس کا مصنف ہوتا۔" (6)

عربی زبان و ادب کے معروف اسکالر، سفرنامہ نگار اور نقاد محمد کاظم نے لکھا کہ:

> "محمد خالد اختر نے ۱۹۵۰ء میں اپنا ناول 'بیس سو گیارہ' لکھا، جو بہ ظاہر ایک فینٹیسی تھی لیکن در حقیقت کنایاتی پیرائے میں ایک خوش طبع مگر جان دار طنز تھی اور اس لحاظ سے اُردو ادب میں ایک بالکل ہی نئی چیز۔"(7)

سعادت حسن منٹو کے چچا سام اور دیگر فرضی کرداروں کے نام لکھے شاہکار خطوط بھی اس صنف کے ساتھ منٹو ہی کے انداز کا ایک انوکھا رومان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو میں عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت کے "زرنیخ کے خطوط"، شفیق الرحمان کی "تزکِ نادری"کرشن چندر کی "ایک گدھے کی سرگزشت" کنہیا لال کپور کی "تحریفات"، ابنِ صفی کے "جاسوسی کردار"، اشفاق احمد کا "تلقین شاہ"، رفیق حسین کے جانوروں کے افسانے، عطاالحق قاسمی کی"غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور"، فکر تونسوی کی "چاند اور گدھا" اور احمد عقیل روبی کا ناول "چوتھی دنیا"اُردو فینٹیسی کے عمدہ نمونے ہیں۔ راقم کی کتاب "ذاتیات"میں شامل ایک مضمون"بائیسویں صدی کا ایک مکالمہ"بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ادبی تصانیف کے ساتھ فلموں اور ٹیلی وژن میں بھی فینٹیسی کی تکنیک کو تفریح اور کسی خاص پیغام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چند برس قبل بھارتی اداکار عامر خان کی فلم "پی ۔کے" میں بھی اس حربے کا خوب استعمال کیا گیا تھا، جس میں مریخ سے آیا ہوا ایک آدمی اہلِ دنیا کے دوغلے پن کی قلعی نہایت سلیقے اور سفاکی کے ساتھ کھولتا چلا جاتا ہے ۔ اسی طرح پاکستان ٹیلی وژن سے اے حمید کا بچوں کا ڈراما "عینک والا جِن" ، اطہر شاہ خان کا ڈراما "با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار" ، بختیار احمد کا "کشمیر کا مقدمہ' اس سلسلے کی خوب صورت مثالیں ہیں۔نئے دور کی ایک ابھرتی ہوئی افسانہ

نگار زنیرا بخاری نے بھی اپنے دونوں افسانوی مجموعوں "چندرا وتی" اور "مائیگرین اور محبت"میں بھی مضبوط و مربوط متخیلہ کے بل بوتے پر قارئین ادب کو کئی تازہ اور انوکھی کہانیاں دی ہیں۔

دنیا کی دیگر زبانوں بالخصوص انگریزی میں اس سے جو ادبی معجزے دکھائے گئے ہیں، اُردو ادب میں تو اس کا عشرِ عشیر بھی موجود نہیں، جس کی بنا پر ہم ایک شان دار قسم کی ادبی و معاشرتی تفریح، اور لذیز قسم کے علمی تحیّر سے محروم رہ گئے ہیں۔ہمارے جاہل معاشرے میں ذہنی غذا کی اس کمی کو محض جعلی پیروں کے من گھڑت قصوں، گم راہ کُن فقیروں کے تخیلاتی معجزوں اور قبر پرستی کی فرضی اور خود غرضی پر مبنی کہانیوں سے پورا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، جب کہ لوک کلچر میں لوگوں کی ذہنی غذا کے اِس خلا کو کسی قدر بہتر انداز میں پُر کرنے کے لیے مُلّا نصرالدین، شیخ چِلّی، عمرو عیّار، علی بابا جیسے مستقل کردار تخلیق کیے گئے، بچوں کی توجہ کھینچنے کے لیے دنیا بھر میں تصوراتی کارٹون بنائے جاتے ہیں اور ہمارے لوک کلچر میں عوام الناس کی تسکین کے لیے عشق و محبت کے عام واقعات کو مبالغہ آمیز رومان کے ساتھ بیان کر کے ان کی تفریح کا سامان کیا گیا ۔

اُردو میں جدیدیت کے مرض اور مغرب پرستی کے ہیضے نے ادب کے قاری کا سب سے بڑا نقصان یہی کیا کہ مقبول اور تفریحی ادب کو تیسرے درجے میں جا کھڑا کیا۔آج بے برکت، بے رس اور خشک انگریزی تنقید کے رسیا اِس حقیقت کو بھولے ہوئے ہیں کہ کسی بھی زبان کے ادبِ عالیہ کی تفہیم و تسکین کے لیے غیر زبانوں کے اجنبی، غیر مقامی، ہماری اقدار سے ناآشنا سانچوں سے کام نہیں چلایا جا سکتا ۔ ہر زبان اپنی تہذیب، مزاج، اور رسوم کی آئینہ دار ہوتی ہے، اس میں تخلیق ہونے والے ادب کی تفہیم، تحسین حتیٰ کہ تنقیص کے لیے بھی اسی ماحول اور مزاج کے اطوار کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ معروف بھارتی نقاد جناب اظہار عثمانی پاپولر اور تفریحی ادب کے حوالے سے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اگر اُردو زبان و ادب کا موازنہ دوسری زبانوں کے ادب سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کتنی ہی زبانیں پاپولر لٹریچر کو ادب مان چکی ہیں۔ ان کے یہاں ادبِ عالیہ یا پاپولر لٹریچر کی کوئی تفریق نہیں ہے، صرف ادب ہے، لیکن اُردو کا نقاد آج بھی وہی پرانا راگ الاپ رہا ہے ۔ دراصل اس تنازع کی جڑ نقاد ہی ہیں، جنھوں نے ادبِ عالیہ اور پاپولر لٹریچر کے درمیان ایک کھائی کھود رکھی ہے۔" (8)

فینٹیسی کی دنیا میں ڈھنگ سے داخل نہ ہونے سے اُردو دنیا کو دو طرح سے نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک تو یہ کہ ہم اچھے تفریحی ادب سے محروم رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے پاس شفیق الرحمان کے علاوہ تفریحی ادب کا شاید ایک بھی قابلِ ذکر نمایندہ نہیں۔ دوسرے ہم اردو دنیا کے سب سے بڑے اور وطنِ عزیز کے قومی شاعر کے ڈھیر سارے اعلیٰ درجے کے کلام سے حظ اٹھانے او ر اس کی مکمل تفہیم سے آج تک محروم ہیں۔

اِس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حضرتِ اقبال کی شاعری میں جو حُسن ، رعنائی اور دانائی، فینٹیسی کے کامل شعور اور اس کے فن کارانہ استعمال سے پیدا ہوئی ہے، وہ شاید ہی کسی اور ادبی اسلوب یا شاعرانہ مہارت سے ممکن ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے پاس جتنا بڑا پیغام ، جتنا توانا فلسفہ، جتنے ثقیل حقائق اور جتنا عمیق مطالعہ تھا ، اگر وہ اس کے ادبی اظہار

کے لیے موزوں اسلوب ، مناسب ذائقے اور ہر دل عزیز فلیور ( Flavour) کا انتخاب نہ کرتے تو اُن کے کلام کو پند و نصائح کا دفتر اور بھاری بھرکم فلسفیانہ دستاویز بننے سے کون روک سکتا تھا؟ اُردو ادب کے معروف استاد اور محقق ڈاکٹر وحید قریشی ادب میں متخیلہ کی بے پناہ اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تخیل کی منزل، حقائق کی منزل سے پہلو بچا کر چلتی ہے۔اس میں حرکت اور عمل نسبتاً زیادہ آزاد ہوتے ہیں۔ یہاں تخیل کی برق روی ، واقعات کی سست روی کا بدل تلاش کرتی ہے۔ ہر فوری خواہش، ہر فوری واقعہ، جذبات و احساسات کی فوری تکمیل کا سامان مہیا کرتا ہے۔ وہ خواہشیں جو عام زندگی میں برسوں پوری نہیں ہو پاتیں یا جن کے پورا ہونے کا کوئی اِمکان نہیں ہوتا، انھیں مجبور اور بے بس انسان تخیل کی مدد سے پورا کرتا ہے۔ اس طرح اپنے ماحول سے بلند ہو کر صاحبِ فن ، زندگی کو گوارا اور ماحول کو سازگار بنا لیتا ہے۔ زندگی کے ٹھوس حقائق ، تعمیر و تاویل اور تخیل کی رنگ آمیزی سے داستانوں میں زیادہ دل فریب اور جاذب ہو جاتے ہیں۔یہاں زندگی ہمارے لیے ایک نئی معنویت اختیار کرتی ہے۔ شجر و حجر، چرند پرند، غرض کہ زندگی کا ہر ذرہ ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے اور عام انسانی خواص سے متصف ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ داستانوں میں زندگی سے رشتہ قائم تو رہتا ہے لیکن اس تعلق کی بنیاد روزمرہ کے واقعات کے فرسودہ نظام پر نہیں ہوتی بلکہ اسباب و علل کے متعارف طریقوں کے پہلو بہ پہلو تخیل کی ہفت رنگ جنت بھی آباد ہے۔ یہاں معاشرتی زندگی کی جھلک ایک ذرا فاصلے پر نظر آتی ہے۔ داستان گو کا جذباتی لہجہ، روزمرہ کے کوائف کو سنوار کر زیادہ گوارا اور قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔"(9)

حضرتِ اقبال اپنے کلام کو قبولِ عام اوربقائے دوام کے سنگھاسن پر بٹھانے کے لیے جن شعری محاسن کو سب سے زیادہ کام میں لائے، ان میں مکالمہ اور فینٹیسی کا درجہ سب سے بلند ہے۔ آج اس بات پہ بھی تأمل کرنے کی ضرورت ہے کہ اقبال کو دنیا بھر کے ادب میں قبولِ عام کا درجہ اختیار کر جانے والے اس حربے پہ اس قدر اعتماد تھا کہ انھوں نے دیگر زبانوں سے بچوں کے لیے بھی زیادہ تر ایسی نظموں سے اخذ و استفادہ کیا، جن میں فینٹیسی کا عنصرموجود تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اقبال کی شاعری کے پہلے سنگِ میل "بانگِ درا"کی تو دنیا ہی متخیلے کی سرزمین پہ آباد ہوئی ہے۔ یہی متخیلہ ہمارے شاعرِ باکمال کو کہیں ہمالہ کی پیشانی چومتے آسمان کا نظارہ کراتا ہے اور کہیں فیلِ بے زنجیر کی مانند فرطِ طرب سے جھومتے ابر دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں لیلیٔ شب کی زلفِ رسا کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے تو کہیں اس کے رخسار پہ رنگِ شفق کا غازہ خوش نما لگتا ہے، بلکہ اقبال کی چشمِ تصور نے تو وہ کلیاں بھی مشاہدہ کر لی ہیں جنھیں کبھی دستِ گل چیں کی جھٹک کا بھی تجربہ نہیں ہوا۔اس تخیل در تخیل سے بھی شاعر کی تسلی نہ ہوئی تو خود ہمالہ سے اس کے نقطۂ آغاز کی بابت یوں گویا ہوتے ہیں:

اے ہمالہ ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا

مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن تِرا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا

داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو (10)

ظاہر ہے یہ نظارہ چشمِ تصور ہی سے ممکن ہے۔ پھر ہمارا یہی شاعرِ بلند پرواز تخیل کی زقند لگا کر اُس عہدِ طفلی میں جا پہنچتا ہے جہاں وسعتِ آغوشِ مادر ہی پورے جہاں پر محیط ہے۔ اسی تخیل کی اوٹ سے وہ غنچۂ گل کو ذوقِ تبسم اور چشمۂ کوہ کو شورشِ قلزم عطا کرنے والے زادۂ بحر اور پروردۂ خورشید (ابرِ کہسار) کی قسمت پہ رشک کرتے ہیں۔ خفتگانِ خاک سے حیات بعد از موت کی بابت سارے کا سارا استفسار بھی تخیل کی انگلی پکڑ کے ممکن ہو پاتا ہے اور اسی متصورہ ہی کے بل بوتے پر معمولی سی شمع اور بے بضاعت سے پروانے(شمع و پروانہ) کے لیے اتنی منفرد تشبیہہ اور اتنی عظیم تلمیح تراشی جا سکتی ہے کہ:

ع چھوٹا سا طور تُو ، یہ ذرا سا کلیم ہے !(11)

پھر اسی متخیلہ کے بل بوتے پر انھیں غنچۂ دلی(غالب) گلِ شیراز (حافظ)پر خندہ زن دکھائی پڑتا ہے اور تصور کے اسی رتھ پر سوار ہو کر وہ 'گہوارۂ علم و ہنر' (دلی) سے استفسار کرتے ہیں:

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟

تجھ میں پنہاں کوئی موتی تاب دار ایسا بھی ہے؟ (12)

اسی طرح 'عقل و دل' کا مکالمہ ہو یا "صدائے درد" ، "آفتاب"کو خراجِ تحسین ہو یا شمع سے شاعر کا موازنہ، کہیں بھی تخیل کا تڑکا لگائے بغیر بات کا بننا سہل نہیں تھا اور پھر "ایک آرزو" تو سر تا پا ہے ہی تخیل و تحیر کی دنیا میں موجیں مارنے کا عمل۔اسی طرح "گلِ پژمردہ"کے ماضی کا چشمِ تصور سے مشاہدہ کرنا، "ماہِ نو" کو خورشید کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا ٹکڑا قرار دینا، نسیمِ صبح کا کھیت کے کنارے سوئے دہقان کو شانے سے پکڑ کے جگانا(پیامِ صبح) ، فرشتوں کا شبنم کو رونا سکھانا (عشق اور موت) اور اقبال کو مجموعۂ اضداد سمجھنے والے ہمسایہ مولوی کا قصہ نیز اس کے خدشات کے جواب میں اقبال کا یہ اعتراف کہ:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے(13)

یہ بھی فینٹیسی ہی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اسی طرح نظم "شاعر" میں قوم، افراد، صنعت کاروں، حکمرانوں اور شعرا کو ایک ہی جسم کے مختلف اعضا قرار دینا بھی لطیف متخیلہ ہی سے ممکن تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمرسن کی طرح شاعرِ مشرق کی روح بھی اتنی بے چَین ہے کہ شہر اسے آباد ویرانے لگتے ہیں، اس لیے اس کی چشمِ حیراں اور آوارہ تخیل اسے سکوتِ دامنِ کوہ میں نرگس و شہلا و گل و بلبل کی ہمسائیگی میں اپنی الگ سے دنیا بسانے پر اکساتے ہیں۔ وہ "طفلِ شیر خوار" کو دیکھتے ہیں تو خیالوں ہی خیالوں میں اس کی ہم عمری اختیار کر لیتے ہیں:

تیری صورت گاہ گریاں، گاہ خنداں مَیں بھی ہوں

دیکھنے کو نوجواں ہوں ، طفلِ ناداں مَیں بھی ہوں(14)

تصور کی اسی لہر میں "کنارِ راوی" کھڑے ہو کر انھیں دریا کا پانی محوِ سرود دکھائی دیتا ہے اور زیرِ آب شفق کی سرخی میں سورج کی گل کاریاں محسوس ہوتی ہیں:

ع شفق نہیں ہے ، یہ سورج کے پھول ہیں گویا (15)

سب جانتے ہیں کہ "حقیقت حسن"میں سجائی گئی عدالت محض تخیل کی وادی ہی میں ممکن تھی اور"۔۔کی گود میں بلی دیکھ کر" اور "چاند اور تارے" کا منظر نامہ بھی لطیف متخیلہ ہی کا مرہونِ منت ہو سکتا تھا۔ اسی طرح دوحصوں پر مشتمل نظم "عاشقِ ہرجائی"پڑھ کے تو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال خود ایک مجسم فینٹیسی کی صورت اختیار کر گئے ہیں کیونکہ ایسا اجتماعِ ضدین حقیقت میں تو ممکن نہیں، جو ایک ہی وقت میں تنہائی کا شکار بھی ہے اور ہنگامۂ محفل بھی...... زینتِ گلشن بھی ہے اور آرائشِ صحرا بھی...... زمیں فرسا بھی ہے اور تاروں کا ہم نشیں بھی......جو موج کی صورت رواں بھی ہے اور مثلِ ساحل افتادہ بھی...... حکمت آفرین بھی ہے اور سودائی بھی......غرض یہ کہ وہ ایک ہی ساعت میں حسنِ نسوانی کے آستانے پہ جبیں فرسا بھی ہے ، جس کی پیشانی شغلِ مے میں سجدہ ریز بھی ہے...... وہ تلوّن کیش بھی ہے اور پہنچا ہوا درویش بھی...... اس نظم کے یہ تین اشعار مطالعہ کر کے فیصلہ کیجیے کہ ایسی ہستی حقیقی زندگی کے زیادہ قریب ہے یا فینٹیسی کے!

سچ اگر پوچھے تو افلاسِ تخیل ہے وفا

دل میں ہر دم اِک نیا محشر بپا رکھتا ہوں مَیں

فیضِ ساقی شبنم آسا ، ظرفِ دل دریا طلب

تشنہ دائم ہوں ، آتشِ زیرِ پا رکھتا ہوں مَیں

مجھ کو پیدا کر کے، اپنا نکتہ چیں پیدا کیا

نقش ہوں، اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں مَیں(16)

حق بات تو یہ ہے کہ اقبال جب تک فینٹیسی کی دھونی نہ رمائیں ، ان کے عظیم اور منفرد افکار ، وجد میں ہی نہیں آتے۔ آپ ان کی معروفِ زمانہ نظمیں "شکوہ"اور "جوابِ شکوہ" ہی کو دیکھ لیں ، جن میں تخیل کی کئی دنیائیں آباد ہیں، جن میں کہیں تصور، حقیقت سے گلے ملتا ہے اور کہیں ماضی، حال سے گتھم گتھا ہے۔کہیں عمل، بے عملی سے الجھتا ہے، تو کہیں انسان خود ، خدا سے برسرِ پیکار ہے۔ ذرا "جوابِ شکوہ" کا یہ آغاز ملاحظہ ہو:

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مِرا

آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مِرا

پیرِ گردوں نے کہا سن کے ، کہیں ہے کوئی

بولے سیارے ، سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا ، نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مِرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنّت سے نکالا ہوا انساں سمجھا
تھی فرشتو ں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا؟
عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا!
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا؟
آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا!
غافل آداب سے سُکّانِ زمیں کیسے ہیں؟
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں؟(17)

یہ ساری فینٹیسی اقبال کے زرخیز ذہن کی پیدا وار ہے، اور ظاہر ہے کامیاب اور مقبولِ خاص و عام فینٹیسی بیٹھے بٹھائے وجود میں نہیں آ جاتی۔ اس کے لیے ماضی و حال سے حد درجہ واقفیت، عظیم مقاصد، دل کش اسلوب ، باطنی آگہی اور مختلف زبانوں، زمانوں، تہذیبوں اور علوم سے آگاہی از حد ضروری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں "بانگِ درا" کی نظمیں پورے ادبی عالم کی توجہ کھینچنے میں کامران ٹھہریں۔ ان نظموں میں فینٹیسی کا قرینہ نہایت اعلیٰ شکل میں میسر ہے۔ "بانگِ درا" کی مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ بھی مرغِ سرا اور مرغِ ہوا کے مابین "ایک مکالمہ" ، "شعاعِ آفتاب" سے اضطراب کی بابت دریافت کرنا نیز 'پھولوں کی شہزادی"خضرِ راہ" حتیٰ کہ اسی مجموعے کے ظریفانہ کلام میں گائے کا اونٹ اور مچھر کا شاعر سے مکالمہ، فینٹیسی پہ شاعرِ مشرق کے اعتماد اور اس کی مختلف جہتوں پہ دسترس و مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

"بانگِ درا"کے بعد کی شاعری میں اقبال کے کلام میں اگرچہ فلسفہ، سیاست اور عالمی امور کا بیان نسبتاً غالب ہے لیکن یہاں بھی فینٹیسی کی ترکیب، انداز و اطوار بدل بدل کے ان کے کلام سے جھانکتی ہے۔ "بالِ جبریل" میں غزلیات کا پلڑا بھاری ہے لیکن جہاں جہاں شاعر کا رخ نظموں کی جانب پلٹتا ہے وہاں "لینن خدا کے حضور میں" ، "فرشتوں کا گیت" ،"مُلا اور بہشت" ، "نصیحت" ، "پیر و مرید" ، "جبریل و ابلیس" ، "اذان" ، "نادر شاہ افغان" ، "ابلیس کی عرض داشت" ، "پرواز" ، "شاہین" ، "شیر اور خچر" اور "چیونٹی اور عقاب" جیسی فینٹاسی تخلیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس مجموعے کی دو نظموں"فرشتے جنت سے آدم کو رخصت کرتے ہیں" اور"روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"میں تو اس بیانیے کا عروج دکھائی دیتا ہے۔ فینٹیسی یا فینتاسی کا کمال یہ ہے کہ جہاں تاریخ، مذہب، فلسفہ اور تہذیب خاموش ہوتے ہیں، وہاں فینٹیسی بولتی ہے۔ عام آدمی کی تو سمجھ سے بالا ہے کہ آدم کے فردوس بدر ہونے کے بعد ان پہ کیا گزری ہوگی؟ اس نے زیست کا آغاز کیسے کیا ہوگا؟ اس کی دست گیری کرنے کون آیا ہوگا؟دنیا کا کوئی علم اس سلسلے میں ہماری

معاونت نہیں کرتا لیکن اقبال کی نظمیں پڑھتے ہیں تو مزہ آ جاتا ہےفینٹیسی یہاں اپنے پورے وجود، خلوص اور اعتماد کے ساتھ وارد ہوتی ہے۔ پوری نظم تسلّی، حوصلے، تھپکی، تنبیہ اور اِمکانات کی نوید سے لبالب ہے۔ انداز ملاحظہ ہو:

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ

ایّامِ جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ(18)

"ضربِ کلیم"کی شاعری پہ اگرچہ حقیقت پسندی، حالاتِ حاضرہ اور زمانی و بین الاقوامی مسائل و وسائل کا غلبہ ہے، اس لیے فینٹیسی کا عنصر کم ہے۔ اپنی نظم "مصور" میں اقبال خود زمانے کی نفسا نفسی اور معروضیت میں متخیلہ کے زوال پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں:

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل

ہندی بھی فرنگی کا مقلّد ، عجمی بھی

مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد

کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی(19)

اس کے باوجود اس مجموعے میں "تقدیر(ابلیس و یزداں)" ،"نسیم و شبنم" ، "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" ، "نصیحت" اور "ایک بحری قذاق اور سکندر" میں فینٹیسی کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔ علامہ کے آخری مجموعے "ارمغانِ حجاز" میں فینٹیسی پھر اپنے جوبن پہ دکھائی دیتی ہے اور "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اس کی واضح دلیل ہے۔ علاوہ ازیں "بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" ، "تصویر و مصور" ، "عالمِ برزخ" اور "آوازِ غَیب" اس کی خوب صورت اور روشن مثالیں ہیں۔ ان کے فارسی کلام میں بھی یہ سلسلہ پوری آب و تاب سے جاری رہتا ہے۔ بالخصوص ان کی شاہکار تصنیف"جاویدنامہ" کے اوراق میں، پیرِ رومی کی معیت میں کیے جانے والے سات سیاروں کے انوکھے سفر کی حیران کن روداد ہے، جس میں جا بہ جا اقبال کے زوردار اسلوب اور زرخیز متخیلہ نے ایسی گل کاریاں کی ہیں کہ اس سے ان کے کلام کاحسن کئی بالا ہو گیا ہے۔

اسی بے پناہ متخیلہ یا فینٹیسی کے استعمال کا سلیقہ ہے کہ آج اقبال کے ‘جاویدنامہ’ کو ہزار سالہ ایرانی ادب کی پہلی چھے (Top Six)کتب میں شامل کیا گیا ہے، بلکہ بعض ایرانی ناقدین کا تو برملا کہنا ہے کہ ‘جاویدنامہ’ کا توڑ پورے ایرانی ادب کے پاس نہیں ۔ اقبال خود اس انوکھے شاہکار کو اپنی تخلیقی زندگی کا حاصل قرار دیتے تھے۔ جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی ایک تحقیق( اقبال کی ایک تحریر بہ سلسلہ ‘جاویدنامہ’ ) کے مطابق:

"علامہ اقبال کا شعری اور تخلیقی شاہکار ‘جاوید نامہ’ ان کے ایک طویل فکری منصوبے کا نتیجہ ہے۔

اس کا ابتدائی خیال تو ۱۹۰۳ء سے ان کے ذہن میں موجود تھا، مگر اس کا آغاز بہت بعد (۱۹۲۷ء)

میں ہوا، اور تکمیل ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں جب وہ ‘جاوید نامہ’ لکھنے میں مصروف تھے، محمد جمیل

خاں کے نام ایک خط میں لکھا کہ مَیں اسے اپنا Life Work (حاصلِ حیات) بنانا چاہتا ہوں۔"(20)

مختصر یہ کہ ایک مضمون، اتنے زرخیز اوربے پناہ موضوع کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کلامِ اقبال میں فینٹیسی کا کھوج کسی ڈاکٹریٹ کے مقالے کا متقاضی ہے۔ اس کے لیے نہ صرف اقبال کی اردو ، فارسی نظموں میں فینٹیسی کا سراغ لگانے کی ضرورت ہے بلکہ ان محرکات و مقاصد کی نشان دہی بھی ضروری ہے، جنھوں نے اس عظیم شاعر کو عمر بھر فینٹیسی کی زلفِ گرہ گیر کا دیوانہ بنائے رکھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اٹھارھویں صدی میرتقی میر ؔ کی صدی ہے۔ انیسویں صدی متفقہ طور پر اسداللہ خاں غالبؔ کے نام ہے اور بیسویں صدی کے اوپر اقبالؔ کے نام کا پھریرا لہراتا ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ بیسویں صدی کے رُبع اوّل میں اقبال ایک جِن کی صورت نمودار ہوا، جو اپنے پورے ادبی عہد کو کھا گیا۔ یہ کیسا انوکھا مگر خوشگوارسانحہ ہے کہ اس زمانے کے اُردو شعرا پہ انفرادی نظر کریں ، تو ایک سے ایک مہان قلم کار چھپا پڑا ہے۔ایسے ایسے باکمال کوی کہ جن کی دیو قامتی کی قسمیں اُردو کے ہر نقاد نے کھائی ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ جیسے ہی ان شعرا کو حضرتِ اقبال کے مقابلے پہ کھڑا کرتے ہیں، وہ اپنی ساری عظمت و انفرادیت کے باوجودپلک جھپکتے میں بونوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔

اقبال اپنی طرز کا ایک ایسا نابغہ ہے جو اپنے عہد کی نہ صرف ادبی بلکہ سماجی، سیاسی ، مذہبی ، تعلیمی اورقانونی زندگی کا سب سے توانا حوالہ بن گیا۔ آپ خود ہی سوچیں جب اس دور کے خاص سے خاص شعرا اور دانش مند بھی ان کے فکر و فلسفہ اور کلامِ بلاغت نظام کی تاب نہ لا سکے، ایسے میں اس دَور کے عام شعرا کا جو حال ہوا ہوگا، اس کی کیفیت نثر میں بیان کرنا ممکن نہ ہوا تو دماغ دھرتی پہ شاعرانہ متخیلے کا نہال پروان چڑھتا چلا گیا۔ ذیل کے اشعار میں انھی معروف مگر مظلوم شعرا کی صورتِ حال کو چشمِ تصور یا دوسرے معنوں میں فینٹیسی کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ نظم بیسویں صدی کے ایک عام شاعر کا اپنے عہد کے ایک ضرورت سے زیادہ خاص شاعر کو خراجِ تحسین بھی ہے، شکوہ بھی ہے، اپنی ناقدری کا گِلہ بھی ہے، غرض یہ کہ متخیلہ یا فینٹیسی کی مدد سے اس میں بُغض، حسد، شکایت، بے بسی،ہجو،قصیدے، اعتراف، عقیدت اور دلداری و گِریہ زاری کے جذبات رل مِل گئے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ اقبال کی فینٹیسی پسندی پہ غور کرتے کرتے یہ نظم بھی فینٹیسی کی صورت میں نزول کرتی چلی گئی۔ پھریہ بھی عین حقیقت ہے کہ یہ جرأتِ گفتار قدرتی طور پر اقبال اور ہماری اپنی ٹھیٹھ مادری زبان (پنجابی) میں عطا ہوئی ہے۔(جس کی اُردو ترجمانی کی بھی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ تسلیم کہ اُردو میں نظم کے اصل تیور پوری طرح منتقل نہیں ہو سکے) اس لیے اسے اقبال اور اس کے دوستوں، لنگوٹیوں اور ہم عصروں سے روزمرہ کا بے تکلفانہ مکالمہ سمجھ کے مطالعہ کیا جائے۔ یوں سمجھ لیں کہ اس نظم میں اقبال سے اس کا ایک ایسا بے تکلف دوست، معاصر شاعر، نظر انداز ادیب اور ٹھیک ٹھاک حاسد مخاطب ہے، جو اقبال کے فن کا معترف بھی ہے ، زمانے کے رویوں سے شاکی بھی ہے، اس کے اندر اپنے ہی دوست سے پیچھے رہ جانے کا قدرتی حسد بھی ہے۔ اس کے دل میں لوگوں کے دوہرے معیار کا رنج بھی ہے، پھر ان الفاظ میں اقبال جیسے بڑے اور معروف شاعر کی جانب سے بچپن کے ایک دوست کی

یاوری نہ کرنے کا شکوہ بھی جھلکتا ہےـمختصر یہ کہ نظم کے عنوان ہی سے مدعی کا عندیہ، تیور، موقف، مسئلہ اور عزائم مترشح ہیں۔ عنوان ہے:

**توں وڈا اقبال تے ویکھ!**

(تو کہاں کا اتنا بڑا شاعر بنا پھرتاہے)

سارے ہوش بھلا دِتے نی — فلسفی پڑھنے پا دِتے نی
عالم سب یرکا دِتے نی — شاعر نُکرے لا دِتے نی
من مستی دی عینک لاہ کے — اپنے آل دوال تے ویکھ

(تیری روز افزوں شہرت و عظمت نے ہمیں ہوش و خِرد سے بے گانہ کر دیا ہے، جس کی بنا پر نہ صرف ہم جیسے شاعر ادیب بلکہ بڑے بڑے فلاسفر بھی مشکل میں ہیں۔ تیری علمی ہیبت کے آگے نہ صرف نام نہاد عالم فاضل دبک اور پِچک کے رہ گئے ہیں بلکہ تمھارے ہی بھائی بند شاعر ادیب بھی تم سے بے پناہ مرعوب ہیں۔کسی وقت اپنی شہرت کا خمار کم کر کے ذرا اپنے ارد گرد پہ بھی نگاہ کر)

توں وڈا اقبال تے ویکھ!

ساڈا دِیوا بلن نئیں دِتا — پَج کے وی توں رلن نئیں دِتا
انہونی نوں ٹلن نئیں دِتا — کِسے نوں لُچ وی تلن نئیں دِتا
کِسے زبان دی ہسٹری اندر — ایسی ہور مثال تے ویکھ

(جانے تیرے قلم میں کیا جادو ہے کہ تمھاری شاعری کے سامنے کسی اور کا چراغ نہیں جل سکا اور ہم جیسے قافیہ پیما تو دوڑ دوڑ کے بھی تمھارے برابر نہیں آ سکے۔ لگتا ہے ہمارے اوپر کسی انہونی کا اثر ہو گیاہے کیونکہ شاعری سے آج تک ہمارے کسی بھی طرح کے اچھے برے مقاصد پورے نہیں ہوئے مجھے نہیں لگتا کہ دنیا کی کسی بھی زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیں ایسی انہونی کی کوئی دوسری مثال مل سکے)

توں وڈا اقبال تے ویکھ!

قافیے بحراں گھڑ گھڑ مر گئے — علم کتاباں پڑھ پڑھ مر گئے
لفظ دے موتی جڑ جڑ مر گئے — آپس دے وچ لڑ لڑ مر گئے
گُم نامی دی دُھپے سڑدے — چِٹے ہو گئے وال تے ویکھ

( دنیا جانتی ہے کہ ہم نے شاعری میں رنگا رنگ بحریں اور قوافی بھی استعمال کیے اور ڈھیرسارا مطالعہ بھی کر رکھا ہے۔ الفاظ کو شعروں میں نگینوں کی مانند جڑنے میں بھی ہمارا کوئی ثانی نہیں اور عام بحث مباحثے میں بھی ایک دوسرے کا بہت سر کھایا ہے۔ کیا بتائیں گم نامی کی شدید دھوپ میں جلتے جلتے اب توہمارے سر کے سارے بال بھی سفید ہو چکے)

توں وڈا اقبال تے ویکھ!

شاعری اسیں وی کردے رہے آں — سوچ دے پالے ٹھردے رہے آں
جیندے رہے آں ، مردے رہے آں — باہر دے رہے نہ گھر دے رہے آں
ادب دی چگّی پیندے پیندے — کِنے ہو گئے سال تے ویکھ

(اس میں کیا شک ہے کہ عمر بھر ہم نے بھی بہت شاعری کی ہے ، سوچ اور فکر کی خنکی میں مسلسل ٹھٹھرتے رہے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ زندگی میں ہر قدم جی جی کے مرتے رہے ہیں ،

یہاں تک کہ ہمیں تو گھر بار کابھی ہوش نہیں رہا۔ زمانہ گواہ ہے کہ ادب کی چکی چلاتے چلاتے بے شمار سال بیت گئے ہیں)

توں وڈّا اقبال تے ویکھا!

موتیاں ورگی شاعری اپنی حالی تیک چھپا نئیں پایا
لِفٹ تے بوہتی دُور دی گل اے سانوں کِسے نے گھاء نئیں پایا
شہرت دا منہ تکن دے لئی بُوتھی ہو گئی لال تے ویکھا!

(اس کے باوجود میرا ہیرے جواہر جیسا کلام آج تک غیر مطبوعہ ہے۔ کلام چھاپنا تو دور کی بات ، کسی حکومت، ادارے یاپبلشر نے ہمیں در خورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ اب حال یہ ہے کہ شہرت کی طلب نے تو ہمارا رنگ روپ بھی دھندلا دیا ہے)

توں وڈّا اقبال تے ویکھا!

صوفی تیرے ناں تے لڑدے مولوی تیر ا کلمہ پڑھدے
عامل وِچ تویتاں مڑھدے عالم رہ گئے قلماں گھڑدے
میرے تے اِتبار نئیں تے چل توں ساڈے نال تے ویکھ

(اصل حیرت اس بات پہ ہے کہ تیری ہر طبقے میں پذیرائی ہے، صوفی اور مولوی، جوایک دوسرے کے ازلی دشمن مشہور ہیں، تیرے کلام کے دونوں دیوانے ہیں۔ اسی طرح عالم اور عامل کی بھی آپس میں کبھی نہیں بنی لیکن یہ دونوں بھی اپنے اپنے مقاصد کے لیے تیرے کلام کا کی تاثیر سے برابر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تجھے اگر میری باتوں پہ اعتبار نہیں تو، تُو میرے ساتھ چل کے یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر سکتا ہے )

توں وڈّا اقبال تے ویکھا!

اُردو دے وِچ تیریاں دُھماں فارسی آکھے سِر منہ چُماں
تیری ودھد ی شہرت اگے اسیں تے بن گئے کچھو کُماں
اپنے عین عروج نوں بھُل کے ساڈا زرد زوال تے ویکھ

(پھر یہ کہ نہ صرف اُردو زبان میں تیرا غلغلہ ہے بلکہ بدیسی زبان فارسی والے خود سربھی تجھے سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ تیری روز افزوں شہرت کے سامنے ہماری حیثیت تو ایک کمزور و ناتواں کچھوے سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسی صورتِ حال میں تو صرف اپنی شہرت میں مست مت رہ بلکہ ایک ہمدردانہ نظر ہماری ناکام حسرتوں پہ بھی ڈال)

توں وڈّا اقبال تے ویکھا!

آپ تے ایتھوں ہجرت کر کے ہور دوارے جا بیٹھا ایں
ادب دے عرش بریں دے اُتے ٓٓٓاَج وی وانگ خدا بیٹھا ایں
پاسے رَکھ کے شہرت اپنی ساڈا مندا حال تے ویکھ

(تم اگرچہ اب اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے دوسری اور اصل دنیا کو سدھار چکے ہو۔ لیکن اس دنیا کے لوگوں پہ جانے کیا جادو کر گئے ہو کہ وہ آج بھی تمھارا ہی کلمہ پڑھتے ہیں۔ کبھی فرصت میسر آئے تو اپنی شہرت سے قطع نظر کر کے ، ایک نظر ہماری درماندگی ، بدحالی اور بے یارو مددگار پہ بھی ڈال لینا)

توں وڈا اقبال تے ویکھ!

اچھے خاصے وسدے پئے ساں کیہڑے پندھے پا دِتا ای
جگ توں وکھری شاعری کر کے سانوں اندے پا دِتا ای
سِنگر ، سادھو پاگل کیتے گاندے پھرن قوال تے ویکھ

(کسی زمانے میں تو ہم بھی تیرے جیسی زندگی ہی گزار رہے تھے، لیکن پھر نہ جانے تو نے ایک دم شاعری کی دنیا میں کیا طوفان برپا کر دیا)

(تم نے ایسی انوکھی اور منفرد شاعری کی ہے کہ جس نے کسی اور کا چراغ جلنے ہی نہیں دیا، بلکہ ہم جیسوں کو تو ایک عجیب اذیت میں مبتلا کر دیا)

(اس وقت عجیب صورت ہے کہ فقیر ہیں تو تمھارے گن گاتے ہیں، گلوکار اورقوال ہیں تو بھی تیرے ہی کلام کے دیوانے ہیں)

توں وڈا اقبال تے ویکھ!(21)

## حوالہ جات


1. *A Dictionary of Literary Terms, Hong Kong, Longmans York press, 1985, page: 84-85*
2. *Encyclopedia Americana Vol: 11 Danbury, Grolier Incorporated international headquarter, 1987, page: 14*
3. راجا عبدالقیوم الیگزینڈر پُشکن (مضمون) الحمرا، لاہور ۲۰۱۹ء ، ص17
4. ایضاً ، ص 18
5. سجاد انصاری محشرِ خیال ، بیکن بکس ملتان ، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص 156
6. کنہیا لال کپور بہ حوالہ 'کلاؤن' از محمد خالد اختر ، افکار، کراچی اکتوبر ۱۹۸۳ء ص: ۲۳
7. معاصر، لاہور، ۱۹۷۹ء ص: ۴۴۰
8. اظہار عثمانی ، پیش لفظ ،اُردو میں پاپولر لٹریچر (روایت اور اہمیت) اُردو اکادمی، دہلی ۲۰۱۵ء، ص 7
9. وحید قریشی ، ڈاکٹر ،افسانوی ادب مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۸۱ء، ص 17، 18
10. محمد اقبال، ڈاکٹر علامہ ، کلیات اقبال، اردو، اقبال اکادمی ، پاکستان، 2018ء، ص53
11. ایضاً، ص 72
12. ایضاً، ص 57
13. ایضاً، ص 93
14. ایضاً، ص 98
15. ایضاً، ص 121
16. ایضاً، ص 149
17. ایضاً، ص 227
18. ایضاً، ص 460
19. ایضاً، ص 635
20. جعفر بلوچ ، مرتب ، اقبال شناسی اور سیارہ ، ، بزمِ اقبال، لاہور ۱۹۸۹ء، ص 99
21. اشفاق ورک، ڈاکٹر، نظم "توں وڈا اقبال تاں ویکھ"غیر مطبوعہ